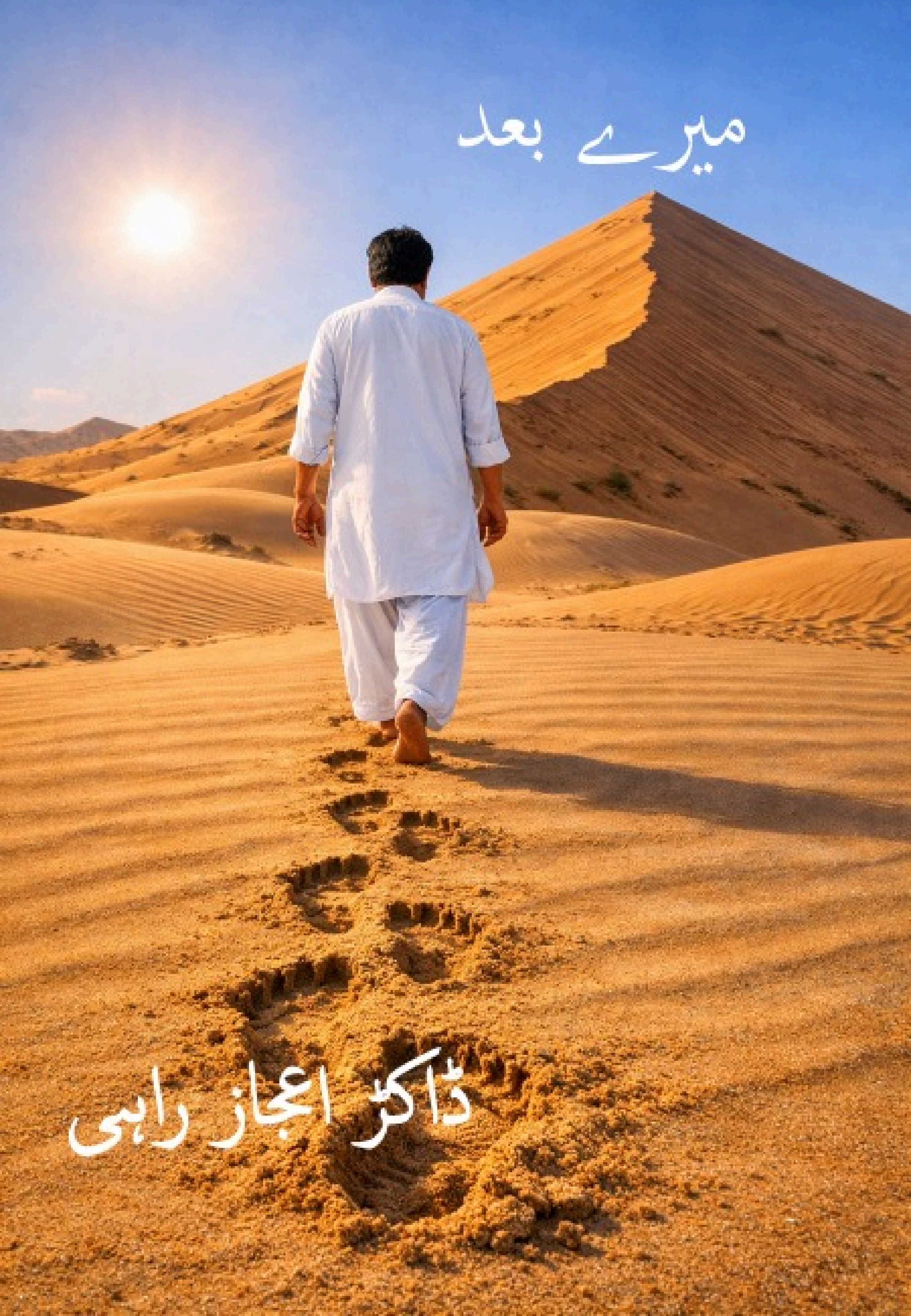

میرے بعد
ڈاکٹر اعجاز راہی

میرے بعد

اشاعتی معلومات

طبعِ اوّل: اپریل 2007ء
تجدیدِ اشاعت: اپریل 2026ء
تعداد: 500
مرتبہ/سرورق: عدیل اعجاز
کمپوزنگ: اکبر سجاد
ناشر: عدیل اعجاز
مکان نمبر : مکان نمبر 2032،گلی 32 ، آئی ٹین ٹو ، اسلام آباد
ویب سائٹwww.facebook.com/drajazrahi

میرے بعد

از

ڈاکٹر اعجاز راہی

فہرست مضامین

مقدمہ

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو سب سے پہلے دو چراغ اس کی زندگی کو روشن کرتے ہیں: ماں اور باپ۔ ماں اپنی مامتا، قربانی اور بے پایاں محبت سے بچے کی روح کو سنوارتے ہوئے اسے زندگی کی پہلی لوری دیتی ہے، اور باپ اپنے اصول، اعتماد اور کردار کی روشنی سے اس کے دل میں حوصلے کے چراغ جلاتا ہے۔ یوں والدین بچے کے لیے پہلی درسگاہ اور پہلی کائنات بن جاتے ہیں۔

یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ بیٹی اپنے والد کے قریب اور بیٹا اپنی والدہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ مگر میرے گھر کا ماحول اس روایت سے مختلف تھا۔ وہاں والدین کم اور دوست و رہنما زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ اسی وجہ سے میری ابو سے ایک ایسی دوستی قائم ہوئی جو وقت کے ساتھ مزید گہری ہوتی گئی۔ آج جب میں 43 برس کا ہوں، تب بھی یہ رشتہ کسی اور سے قائم نہ ہو سکا۔ یہ نہیں کہ میں آدم بیزار ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابو کی موجودگی میں کسی اور کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

اس کتاب کا نام "میرے بعد" تجویز کرنے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ والد مرحوم کی شاعری کا ہر شعر اسی عنوان کا آئینہ دار تھا۔ ان کی شخصیت اور طرزِ زندگی مثالی تھے۔ ایک بار دوستوں کی محفل میں کسی نے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب! آپ کیا کرتے ہیں؟" تو فرمانے لگے: "میں ایک مزدور ہوں، اور قلم کو ہمیشہ کان پر رکھتا ہوں تاکہ جہاں ضرورت پڑے مزدوری شروع کر دوں۔" یہ جملہ ان کی سادگی، محنت اور فن سے وابستگی کا بہترین عکاس ہے۔

میرے والد مرحوم کی زندگی محبت، دوستی اور خدمت کی مثالوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کو کتابی شکل دینا دراصل ان کی یادوں کو زندہ رکھنے اور ان کے فن کو قارئین تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب میں شامل اشعار نہ صرف ان کی فکری گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

اس کتاب کی تیاری، تدوین اور طباعت کے سلسلے میں میں جناب حمید قیصر اور برادرم محمد اکبر سجاد کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ان کی معاونت اور محبت کے بغیر یہ کام ممکن نہ تھا۔ یہ کتاب والد مرحوم کی یادگار ہے، اور میری خواہش ہے کہ قارئین اس کے ذریعے نہ صرف ان کے کلام سے لطف اندوز ہوں بلکہ ان کی شخصیت کی روشنی کو بھی محسوس کریں۔

عدیل اعجاز

اعجاز راہی ہو گئے راہی عدم
اب زندگی کے ساتھ رہے گا یہ غم
جھکنے دیا ناں حرف کی سچائی کا علم
وہ دوست، بھائی، محترم، میرا، وہ ہم قلم

طاہر پرواز

اعجاز راہی کی یاد میں

گلستانِ محبت کی کلی اعجاز راہی تھا
گلِ خوشبو، مروت کی ڈلی اعجاز راہی تھا

خدا نے اس کو توبہ سے متاعِ خیر بخشی تھی
خدائے پاک کا بندہ، ولی اعجاز راہی تھا

رہا شاکر ہمیشہ بر رضائے حضرتِ یزداں
وفاؤں کی ہوا جس سے چلی اعجاز راہی تھا

رہا وہ عمر بھر مدحت طرازِ سیدِ عالم
فدائے گفتہِ غوثِ جلی، اعجاز راہی تھا

ادب کی گتھیاں سلجھائیں اس نے فکرِ احسن سے
ہاں! جس سے آرزو پھولی پھلی، اعجاز راہی تھا

فسانوں سے حقیقت کو اجاگر کر دیا اس نے
ہاں! علم و فضل کی روشن گلی، اعجاز راہی تھا

کرم اعجاز راہی پر، تو کر اے بخشندہِ عالم!
لحد کو اس کی روشن رکھ سدا، رخشندہِ عالم!

بشیر حسین ناظم

اعجاز راہی کی یاد میں

(3 مئی 2006ء کو اسلام آباد میں تادیب انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام منعقدہ ریفرنس میں پڑھا گیا)

تحریر: منشا یاد



میرے مرحوم والد صاحب، اپنی ساری اولاد کے اسلام آباد اور لاہور میں مقیم ہونے اور آخری عمر کی بیماریوں کے باوجود، گاؤں میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم انہیں زبردستی اپنے کشادہ، خوبصورت اور فرنشڈ گھروں میں لاتے، کاروں میں گھماتے پھرتے، مری، دامنِ کوہ اور دیگر خوبصورت مقامات کی سیر کراتے اور ہماری بیویاں طرح طرح کے پکوانوں سے ان کی خاطرتواضع کرتیں، مگر وہ چولہے پر چڑھنے والی مرغی یا

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

کسی سدھائے ہوئے کبوتر کی طرح بار بار گاؤں کی بوسیدہ چھت پر جا بیٹھتے۔ انہیں اس بات کی فکر موت سے بھی زیادہ رہتی تھی کہ ایک دن وہ اپنے بیٹے بیٹیوں کو سخت مشکل میں ڈال دیں گے۔ وہ سوچتے کہ سب اپنے ضروری کاموں میں مصروف ہوں گے کہ اچانک گاؤں سے کوئی خبر آجائے گی اور انہیں دو ڈھائی سو میل کا سفر اچانک کرنا پڑے گا۔ پھر وہ خود ہی ڈھارس بندھا لیتے کہ کوئی بات نہیں، سب کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں اور ایک ہی دن کی تو بات ہے۔

ہم ان کی باتوں کو مذاق سمجھتے رہے، مگر اب جب میرا بیٹا عامر شکیل امریکہ میں ہے، تو میں سوچنے پر مجبور ہوں۔ میں اگرچہ منہ سے نہیں کہتا کہ مجھ پر دیہاتی بے تکلفی کی جگہ شہری تہذیب کا ملمع چڑھ گیا ہے، مگر دل میں یہ خو ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ ایک دن میں اپنے بیٹے کو مشکل میں ڈال دوں گا اور اس بے چارے کو اپنے کتنے ہی ضروری کام اور اپائنٹمنٹس منسوخ کر کے اچانک پاکستان آنا پڑے گا۔
چند روز پہلے میں نے اس المناک ڈرامے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور اعجاز راہی کی صورت میں اپنی موت اور بیٹے کی امریکہ سے آمد کا منظر مشاہدہ کر لیا تھا۔
اعجاز راہی کا جنازہ اٹھانے کے بعد ان کا جسدِ خاکی قبرستان میں ان کے بیٹے شکیل کے انتظار میں رکھا گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ان کی بند آنکھیں کسی دوسری دنیا میں جا کر کھل گئی ہوں گی اور وہ بے تابی سے شکیل کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ میرے بیٹے کا نام بھی شکیل ہے۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اس کی تو کسی ایئر لائن میں جان پہچان بھی نہیں ہے۔ اس ٹھنڈی اور اداس رات کا منظر میرے لیے دوہرے صدمے کا باعث بنا: ایک اپنے عزیز اور پرانے ساتھی کی موت کا صدمہ اور دوسرا اپنی میت پر بیٹے کے بروقت نہ پہنچ سکنے کا۔

اعجاز راہی سے میری پہلی ملاقات تو مجھے یاد نہیں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ رشید امجد کے ذریعے 1960ء یا اس کے فوراً بعد ہوئی تھی، جب میں مری میں کچھ عرصہ گزار کر دوبارہ راولپنڈی آیا تھا۔ میرے مری جانے تک رشید امجد ابھی اختر رشید تھا اور افسانے سے اس کی دلچسپی صرف پڑھنے سننے تک محدود تھی۔ جب میں واپس آیا اور اس سے بزمِ میر میں ملاقات ہوئی تو اس نے افسانے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی، کیونکہ ہم ایک ہی محکمے میں ساتھ کام کر چکے تھے اور وہ میرے درجن بھر ابتدائی افسانے، جو 'شمع' اور 'عکس نو' میں شائع ہو چکے تھے، پڑھ چکا تھا۔ میں اسے نجی طور پر تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ بھی دیتا رہتا تھا، جس پر بعد میں نہ صرف اس نے بلکہ ایس اے ناز اور خود میں نے بھی عمل کیا۔

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

مجھے زندگی بھر حسرت رہی کہ وہ اس سلسلے میں اور افسانہ نگاری سے اپنی ابتدائی دلچسپی کے بارے میں میرا کوئی حوالہ دیتا اور میرا بھی اعجاز راہی کی طرح ذکر کرتا۔ مگر اپنی خودنوشت میں تو اس نے یہ کہہ کر جھگڑا ہی ختم کر دیا ہے کہ اسے میرے افسانے کیسے پسند آ سکتے تھے! کیوں بھائی، اس وقت آپ نے کون سی پی ایچ ڈی کر لی تھی اور کافکا کو پڑھ لیا تھا؟ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

جب میری اعجاز راہی سے ملاقات ہوئی تو وہ جی ٹی ایس میں ملازم تھے اور رشید امجد کے ساتھ ادبی محفلوں میں آیا جایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم راہی کا یہی اعجاز تھا کہ وہ کبھی کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے اور نہ ہی اپنی ماضی کی حیثیت پر شرمسار ہوئے۔ بلکہ وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی محنت سے ترقی کی اور علم و ادب کی منزلیں طے کر کے معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے کئی بار خواہش ظاہر کی کہ ہم چند پرانے دوست ان کے ہاں جمع ہو کر پرانی یادوں کو تازہ کریں اور انہیں ریکارڈ کر لیں۔ ایسی ہی کچھ یادیں انھوں نے اس ادبی خط میں بھی محفوظ کی تھیں جو انھوں نے رشید امجد کو اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔

میری ان سے ابتدائی ملاقاتیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہوتی رہیں، کیونکہ وہ یونین لیڈر تھے اور ان کی سرگرمیاں مختلف نوعیت کی تھیں۔ پھر وہ کہیں اور چلے گئے، مگر ہم ہر ہفتے 'لکھنے والوں کی انجمن' میں ملتے رہتے، جس کی ایک شاخ میں نے اسلام آباد میں قائم کر دی تھی، اور بعد میں حلقۂ اربابِ ذوق میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ایک دوسرے کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ میرے ہاں وہ رات بھر ریڈیو پروگرام کی ریکارڈنگ کے دوران، اپنے ذاتی دکھوں کو چھپانے کے لیے، خوب غزلیں اور گیت سنتے رہتے۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے پہلے، پی آئی اے کے اسلام آباد والے دفتر میں ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں انہیں 'شب خون' کا شمارہ دینے جاتا، کبھی وہ میرے ہاں رسالہ لینے آ جاتے اور ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہتے، جسے ہماری ٹی ہاؤس کی اصطلاح میں 'منافقت کرنا' کہتے ہیں۔

آخری عمر میں پہنچ کر انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ انھوں نے اپنا بہت کچھ رشید امجد پر نچھاور کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے حصے کے بہت سے افسانے بھی نہیں لکھے اور ایک کتاب کے بعد افسانہ نگاری کا کام انہیں سونپ دیا تھا، اور

رشید امجد کی مدح سرائی میں 'فنا فی الرشید' ہو گئے تھے۔ مگر رشید امجد کی طرف سے انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ وہ رشید امجد کی شان میں کبھی کبھار کچھ گستاخیاں بھی کر بیٹھتے کہ وہ بہت سیانا ہے، پائینز اور سرور کامران والے منافقت کے سمندر کی وہیل مچھلی ہے، مگر کیا کریں، میرا یار ہے۔ رشید امجد کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اپنے خط میں بھی انہوں نے کچھ ایسی ہی دبی دبی شکایتیں کی تھیں، مثلاً:

"یوں بھی ساری اچھی چیزیں تم اپنے لیے رکھنے کے عادی ہو۔"

"پھر تم سالہا سال کہانیاں لکھتے رہے اور میں تمہیں داد دیتا رہا۔ گھنٹوں ایک ایک کہانی پر غور کرتے، تم دوبارہ لکھتے اور پھر رکھ لیتے۔ سالہا سال تم لکھنے اور میں تمہیں داد دینے میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ دونوں کو یاد نہ رہا کہ مجھے بھی کہانی لکھنی ہے۔ اور جب یاد آیا تو اس وقت تمہارا قد 6 فٹ 1 انچ ہو چکا تھا اور میرا 5 فٹ 11 انچ پر ہی رک گیا تھا۔"

یوں تو میرے سمیت ہمارے گروپ کے سبھی لوگ سیلف میڈ اور محنتی تھےرشید امجد، اعجاز راہی، مظہر الاسلام اور احمد داؤد۔ سرور کامران شاید پہلے سے بنا بنایا تھا، لیکن محنت اور عظمت کی سب سے روشن مثال اعجاز راہی تھے، جنھوں نے کئی ملازمتیں بدلیں، بار بار صفر سے شروع کیا، بہت سے امتحانات پاس کیے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کے علاوہ بی اے، ایل ایل بھی کر ڈالا۔ افریقہ، ایشیا، امریکہ اور یورپ کی مختلف زبانوں سے ان کے تراجم کا کام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کس قدر استعداد حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے 7 نوبل انعام یافتہ ادیبوں پر تنقید و تحقیق کا کام کیا اور اردو افسانے میں علامت نگاری پر بہت اہم اور شاید سب سے بھرپور کتاب تصنیف کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'تیسری ہجرت' مقامی افسانہ نگاروں میں سب سے پہلا مجموعہ تھا۔

وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور 'بے برکت دعائیں' کے نام سے ان کا خوبصورت شعری مجموعہ شائع ہوا تھا۔ انہوں نے 'شام ڈھلے' اور 'معتوب' کے نام سے دو ناول بھی لکھے، ان کا تیسرا ناول 'خواہشوں کے جزیرے' بھی مکمل ہو چکا تھا۔ وہ کبھی کبھار افسانہ بھی لکھ لیتے تھے، ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'قیدی شاخ' زیرِ طبع تھا، مگر ان کا زیادہ رجحان اب تنقید و تحقیق کی طرف ہو گیا تھا۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں 'اظہار'، 'اردو افسانے میں علامت نگاری'، 'اردو افسانے میں اسلوب کا

آہنگ' وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے تنقید و تحقیق سے متعلق بہت سی تکنیکی کتابیں بھی لکھیں، جیسے 'تاریخ خطاطی'، 'دست شناسی'، 'ادراک ماورائے حسیات'، 'اصولِ تنقید'، 'تحقیق اور اصول'، 'وضع اصطلاحات'، 'اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل'، 'املا اور رموزِ اوقاف' وغیرہ۔

اعجاز راہی کی زیرِ طبع کتابوں میں ناول اور افسانوی مجموعہ کے علاوہ 'بیسویں صدی کے نوبل انعام یافتہ ادیب'، 'اردو افسانے کی ایک صدی' اور 'جدید تنقید کے چار ستون' جیسی اہم ترین کتابیں شامل ہیں۔

موجودہ دور کے حالات اور نفسا نفسی کے کلچر کو دیکھ کر میں نے کچھ عرصے سے دوستوں کے معاملے میں محتاط رویہ اختیار کر لیا ہے اور مولانا الطاف حسین حالی کی اس بات پر بہت دیر سے عمل شروع کیا ہے کہ "بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ، مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ"۔ اتنی عمر گزارنے کے بعد اب سمجھ میں آیا ہے کہ جن دوستوں کو آپ عزیز رکھتے ہیں، ان سے تھوڑا فاصلہ ضروری ہے، ورنہ وہی دوست جو آپ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نہیں تھکتے اور آپ کی ہر غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ پنجابی زبان والے 'شریک' کا روپ دھار لیتے ہیں اور آپ کی جڑیں کاٹنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں ہم سب ایک دوسرے سے کتنے مخلص تھے، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعے سے لگائیے۔

اعجاز راہی کی رحلت پر مجھے ڈاکٹر ایم آئی حسین (خالدہ حسین کے شوہر) کی تعزیتی ای میل موصول ہوئی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ انہوں نے اہل خانہ یا دیگر دوستوں کی بجائے مجھ سے اظہارِ تعزیت کیوں کیا ہے؟ پھر مجھے 1984ء کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اعجاز راہی کو جبری ریٹائرمنٹ دے دی گئی تھی اور وہ بے روزگاری کی چکی میں پس رہے تھے۔ ہم سب دوست اپنی اپنی جگہ ان کی ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ ڈاکٹر ایم آئی حسین ان دنوں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔
محترم فتح محمد ملک اور میرے ان سے اچھے تعلقات تھے، چنانچہ ہم دونوں نے باری باری ان سے اعجاز راہی کی ملازمت کے لیے سفارش کی۔ مشکل یہ تھی کہ اعجاز راہی زیرِ عتاب تھے اور انہیں سرکاری ملازمت دینا رسک لینے کے مترادف تھا، اس لیے ڈاکٹر ایم آئی حسین تامل کر رہے تھے۔

انہی دنوں میں بیمار پڑ گیا اور پولی کلینک میں ایک ماہ کے لیے داخل رہا۔ ایک روز جب مجھے بائی پاس کے لیے آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا، ڈاکٹر صاحب میری مزاج

پرسی کے لیے آئے اور اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ آپریشن تھیٹر جاتے ہوئے میں نے ان سے اپنے لیے دعا کی بجائے اعجاز راہی کی ملازمت کا وعدہ لینے پر اصرار کیا۔ وہ بڑے دھڑلے کے افسر اور مخلص دوست تھے، انہوں نے مجھے اطمینان دلایا اور اپنا وعدہ نبھایا۔ غالباً ڈاکٹر ایم آئی حسین نے اعجاز راہی سے میرے انہی پرخلوص تعلقات کی بنا پر مجھے تعزیتی پیغام بھجوایا۔ ان کا ایک بار پھر شکریہ۔

ضمیر جعفری صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ جب میں نے اعجاز راہی کو پہلی بار حلقے میں تنقید کرتے دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے غصے میں بھرا ہوا کوئی پٹھان درخت پر کلہاڑا چلا رہا ہو اور اسے پتہ نہ چلے کہ درخت کب کا گر چکا ہے۔ لیکن اعجاز راہی تو کلہاڑا چلاتے چلاتے خود درخت بن گئے۔ ان پر زمانے نے بہت کلہاڑے چلائے مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ ہم سب دوستوں میں صرف وہی ایک تھے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلی تھیں اور اسی میں یہ جرأت تھی کہ فوجی آمریت کے دور میں مزاحمتی افسانوں پر مشتمل 'گواہی' جیسا مجموعہ مرتب کر کے شائع کریں اور اس گواہی کا اعلان کریں جو سچے ادیب اپنے اپنے عہد میں دیتے آئے ہیں۔ مجھے یاد ہے میں اور رشید امجد اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ ہر روز ایک دوسرے سے پوچھتے کہ کوئی پوچھ گچھ کرنے تو نہیں آیا؟ مگر اعجاز کو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

اعجاز راہی تھوڑے زود رنج بھی تھے اور جہاں زیادہ پیار ہو، وہاں ناراضی بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی خفگی نہیں ہوئی، مگر ایک بار ڈاکٹر ایوب مرزا کی وجہ سے ان کی رشید امجد سے سخت ناراضی ہو گئی۔ اس جلتی پر بہت سے دوستوں نے تیل ڈالنا ضروری سمجھا اور یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے کئی مہینوں تک پھیل گیا۔ وہ دونوں میرے پرانے دوست اور ساتھی تھے۔ میں نے ایک روز کسی تقریب کے بہانے انہیں اپنے گھر بلایا۔ دونوں نے آنے کا وعدہ کرنے سے پہلے یہ اطمینان کرنا چاہا کہ ان کا ایک دوسرے سے سامنا نہ ہو۔ میں نے دونوں کو اکیلے میں یقین دلایا کہ صرف اسی کو مدعو کیا گیا ہے۔

پہلے رشید آیا، میں نے اسے دوسرے مہمانوں کے ساتھ بٹھایا اور گیٹ پر نظر رکھی۔ جیسے ہی اعجاز آئے، میں باہر نکلا، انہیں گیراج میں لے گیا اور اپنی سوزوکی کے ڈبے میں بٹھا دیا۔ پھر میں رشید کو بلا لایا اور اسے ڈبے کے اندر دھکیل کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا، "تم دونوں میرے سامنے ایک دوسرے سے لڑو، جھگڑو، ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر غصہ نکال لو، مگر جب تک تم دونوں گلے

نہیں ملتے، نہ میں دروازہ کھولوں گا اور نہ ہی تمہیں کھانا ملے گا۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ خوب لڑے، جھگڑے، ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کیں۔ پتہ چلا کہ اعجاز راہی کو رشید امجد کے ہاں پاؤں کی دعوت تھی، جس میں وہ اپنے ساتھ ڈاکٹر ایوب مرزا کو بھی لے گئے کیونکہ وہ دونوں کے مشترکہ دوست تھے۔ اس پر رشید امجد نے کہہ دیا کہ فوارہ چوک میں بہت لوگ ہوتے ہیں، وہاں سے کچھ اور ساتھ لے آتے۔ اس بات پر وہ بھڑک اٹھے اور ایوب مرزا کو بغل میں دبائے وہاں سے روٹھ کر چل پڑے۔ بات یہاں ختم ہو جاتی تو خیر تھی، مگر ستم یہ ہوا کہ رشید امجد ان کے پیچھے آیا۔ وہ سمجھے منانے آ رہا ہے، مگر اس نے ان کے پیچھے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ سارا جھگڑا دروازہ زور سے بند کرنے کا ہی تھا۔ میں نے کہا، "یار، گرو دوارے کا وہ دروازہ لوہے کا ہے، آہستہ بند کرو تو بھی ایسا لگتا ہے جیسے زور سے بند کیا گیا ہو۔ جانے دو۔" اندر مہمان پریشان ہو رہے تھے کہ میزبان سمیت یہ لوگ کہاں گئے اور یہ لڑنے بولنے کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ لیکن آخرکار ان دونوں کی صلح ہو گئی۔

اعجاز راہی کا حلقۂ اربابِ ذوق سے پرانا اور گہرا تعلق تھا، خواہ وہ حلقہ اسلام آباد کا ہو، پنڈی کا یا نیویارک کا۔ انہوں نے ہر جگہ بہت مثبت اور فعال کردار ادا کیا۔ دو برس پہلے جب میں نیویارک کے حلقے میں پہنچا تو وہاں ہر طرف اعجاز راہی کا طوطی بول رہا تھا۔ جوہر میر سے تو ان کی بہت گہری دوستی تھی۔ اشرف میاں، جاوید پاشا اور نصرت انور سب ان کے گن گاتے تھے، بلکہ اب حسن عباس رضا بھی ان میں شامل ہو گئے تھے۔ اعجاز راہی میں بے شمار خوبیاں تھیں، لیکن یہ خوبی ان سب پر بھاری تھی کہ وہ کبھی جھوٹ اور تصنع سے کام نہیں لیتے تھے، کسی سے حسد نہیں کرتے تھے۔ وہ اندر اور باہر سے یکساں روشن اور پاکیزہ تھے۔ بے حد محبت کرنے والے، مہمان نواز اور دوسروں کے کام آنے والے انسان تھے۔

مجھے یاد آ رہا ہے، دو سال پہلے کی بات ہے۔ میری چھوٹی بہن کا جدہ، سعودی عرب میں انتقال ہو گیا۔ اس کا تابوت پی آئی اے کے ذریعے اسلام آباد پہنچ رہا تھا اور ہمیں اسے فوراً گاؤں لے کر جانا تھا۔ خیال تھا کہ ایئرپورٹ پر ہی نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے تاکہ یہاں کے عزیز رشتہ دار بھی شامل ہو سکیں، لیکن ان دنوں سیکیورٹی کے باعث ایئرپورٹ اتھارٹیز اس کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے فون پر اعجاز راہی کو اطلاع دی اور مدد طلب کی۔ اگلی صبح وہ نہ صرف ہم سب سے پہلے خود ایئرپورٹ پر موجود تھے، بلکہ میرے ایک ایک عزیز کو گلے لگا کر تعزیت کا اظہار کرتے رہے اور ہمیں گاؤں روانہ کرنے کے بعد ہی وہاں سے لوٹے۔

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

ایک بار مجھے ان کی ایک لیڈرانہ تقریر سننے کا بھی اتفاق ہوا۔ میں ان دنوں سی ڈی اے میں پی آر او تھا اور سی ڈی اے کی یونین کا کوئی بہت بڑا اجتماع تھا جس میں سیاستدان اور دوسرے محکموں کے یونین لیڈران بھی شریک تھے۔ جب اعجاز راہی بطور مزدور لیڈر مائیک پر آئے تو ان کا جوش و جذبہ دیکھ کر اور ان کی تقریر سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیوں زیرِ عتاب رہتے ہیں اور کیوں انہیں بار بار نوکری سے برخاست کیا جاتا ہے۔ وہ ایک روشن خیال اور ترقی پسندانہ سوچ کے حامل پابند عہد ادیب تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ شخص جس نے زندگی کے دکھ اٹھائے ہوں، آگے بڑھنے کے لیے ٹھوکریں کھائی ہوں اور جسے عملی جدوجہد کرنا پڑی ہو، وہ اسی طرح روشن خیال، انسان دوست اور ترقی پسندانہ نظریات کا حامل ہوتا ہے، جیسا کہ اعجاز راہی تھے۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ اور عزیز و اقارب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعجاز راہی اپنی خوبصورت شخصیت اور حسنِ سلوک کی وجہ سے عزیزوں اور دوستوں کے دلوں میں ہی نہیں، بلکہ اپنی بیش بہا تصانیف کی بدولت علم و ادب کی دنیا میں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

منشا یاد

سعودی عرب سے حجِ اکبر پر خط
28 دسمبر 2006

لبیک اللّٰھم لبیک،
لبیک لا شریک لک لبیک،
ان الحمد والنعمة لک والملک،
لا شریک لک۔

یہ الفاظ میرے کانوں میں یوں گونج رہے تھے جیسے کسی اور جہان سے آتی صدائیں ہوں۔ منیٰ کی دوسری صبح تھی۔ وقت، دن اور تاریخ کا شعور جیسے مٹ گیا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

یہ آوازیں مقناطیس کی طرح میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ میں اس آواز کے مالک کو دیکھ نہیں سکتا تھا، مگر یہ نغمہ میری روح کو گھیرے ہوئے تھا۔ انہی لہروں میں مجھے اپنے سسر، ڈاکٹر اعجاز راہی کی آواز محسوس ہوئی۔ آنکھیں بند تھیں مگر دل چونک اٹھا۔ کہاں سے آگئے؟ کہاں سے مخاطب ہو رہے تھے؟ میں نے تو انہیں یاد بھی نہیں کیا تھا۔ میرا دھیان تو پڑوس کے خیمے سے آتی ہوئی تلاوت پر تھا۔

آواز نے کہا: "میں چاہتا تھا کہ تم اور شکیل حج پر آؤ۔ میرا ایک کام ادھورا ہے: میری خود نوشت میں ایک باب شامل ہونا باقی ہے۔ تمہیں اسے لکھنا ہوگا۔"

میں نے عرض کیا: "مگر انکل، میں اردو نہیں لکھ سکتا۔ آپ کی طرح لکھنا تو ممکن ہی نہیں..."۔

جواب آیا: "یہ انگریزی میں بھی ہو سکتا ہے۔ رفعت تمہاری مدد کرے گی... اور خاندان کو میرا پیغام پہنچا دینا۔"

رفعت سے: "میں تم سے محبت کرتا ہوں"
نرگس سے: "حوصلہ رکھو"
نبیل سے: "نیک تمنائیں"
شکیل سے: "تم محفوظ ہاتھوں میں ہو"
عقیل سے: "خدا تمہیں برکت دے"
عدیل سے: "شکریہ"

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور پوچھا: "وہاں کیسا ہے؟"
انہوں نے جواب دیا: "یہاں روشنی ہے..."۔

میں نے پوچھا: "کیا آپ نے میری والدہ کو دیکھا ہے؟"
فرمایا: "ہاں، وہ خیریت سے ہیں۔" اس لمحے مجھے کسی اور کا خیال نہ آیا، حتیٰ کہ اپنے والد کا بھی نہیں، جن سے میری قربت سب سے زیادہ تھی۔

پھر سوال کیا: "کیا آپ جب چاہیں آ جا سکتے ہیں؟"
جواب مختصر تھا: "ہاں۔" مگر اس "ہاں" میں ایک آزادی، ایک سکون اور ایک وسعت کا احساس تھا، جیسے ہر سمت جانے کی سہولت ہو۔

اچانک مجھے شیبو (صہیب، ڈاکٹر اعجاز راہی کا پوتا) یاد آیا۔ پوچھا: "کیا اپنے پسندیدہ پوتے کے لیے کوئی پیغام ہے؟"
فرمایا: "ہاں، اسے کہو کہ میں اس پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔"

اس لمحے گفتگو کی نوعیت بدل گئی۔ میں دعا کی کیفیت میں ڈوب گیا۔ ان تمام بحثوں، اختلافات اور تلخیوں کے لیے معافی مانگی جو ہمارے درمیان کبھی ہوئیں۔ ان کے ترقی پسند خیالات اور ثقافت سے جڑے اصولوں پر میری تنقید، اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی کمی پر میرا پچھتاوا۔ دل میں آیا: کاش، کاش میں نے

تھوڑی سی بھی حکمت سے کام لیا ہوتا تو ان کے علم و شاعری کے چشمے سے زیادہ فیضیاب ہو سکتا۔

آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ لمحہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے بے شمار لمحوں جیسا تھا: حسن اور شرارت کا امتزاج، کچھ میرے والد کی طرح مگر زیادہ شوخ اور زیادہ اظہار کے ساتھ۔
انکل نے کہا: "کوئی بات نہیں، یہ سب لمحے خوبصورت تھے۔ مجھے بھی ان سے لطف آیا۔"

بھگوَتی دواریکا
نیو یارک، امریکہ

حمد

مٹا دے فرق زماں و مکاں، سب عیاں کر دے
فکر و عمل کو مقام، زینتِ جہاں کر دے

عطا ہو سرِ نفس، دروں کی بصیرت مجھے
نگاہِ شوق کو سوئے لامکاں کر دے

فضا کو گھیر رہی ہے اندھیروں کی بے نوری
اے بحرِ فیض! کوئی موجِ ضوفشاں کر دے

یوں روشنی زمانوں میں ہر سمت پھیل جائے
زمین پر نظامِ عدل کو آسمان کر دے

کبھی تو کھول دے وہ نامکشف حقیقت کو
کبھی تو سامنے آ کے خود کو بھی عیاں کر دے

الوداع

میں جب شام کی دہلیز پر دم توڑتے دن کو افسردگی سے دیکھتا ہوں،
تو کوئی آہستگی سے مجھ سے کہتا ہے :
"چلو، زادِ سفر باندھو... یہ بستی اب پرائی ہو چکی ہے۔ "

سبھی رشتے، سبھی ناطے سبک رفتار لمحوں کی قبا میں ٹوٹنے کو ہیں۔
ایک پل میں شناسائی دیارِ غیر بن کر اجنبیت کو جنم دے گی۔
یہ راہیں، جو ابھی کچھ دیر پہلے میری سانسوں میں دھڑکتی تھیں،
میری آنکھوں کی رونق تھیں،
اب مجھے سیہ تنہائیوں کے کرب میں لے جا کر افق میں ڈبو دیں گی۔

اور میرا نام ایک میلے کے کتبے پر لکھا رہ جائے گا۔
میرے بعد جو اس بستی میں اترے گا،
وہ لاکھوں رفتگاں میں میری تختی کیوں ڈھونڈے گا؟
میرا نام لاکھوں تختیوں میں ڈوب جائے گا۔

وہ کہتا ہے:
"اٹھو، کہ دن کے ڈوبنے کے بعد اب کوئی لمحہ ہوا کے دوش پر ایسا باقی نہیں رہا،
جس سے تمہاری سانسوں کو زندگی کی حرارت مل سکے۔ "

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

مگر اے میرے یارو، اس شام کی دہلیز پر بیٹھے گواہ رہنا کہ میں آج کی اس محفلِ اخلاص و شفقت میں فقط تنکے کی صورت ہوں۔
میں گئے وقتوں کے مرقد پر لگا وہ کتبہ نہیں ہوں جو بارشوں کی زد میں آ کر زمین میں اتر جائے اور وجودِ زندگی کھو دے۔
نہ میں بچے کی تختی پر لکھا وہ حرف ہوں جسے ایک اسفنج کا ٹکڑا مٹا دے۔

میرے یارو، مجھے یاد رکھنا۔
میں اس جہد کا تسلسل ہوں جسے تاریخ نے صدیوں سے اپنے جسم میں محفوظ رکھا ہے۔
کبھی سقراط کی مد میں،
کبھی شبیر کی حد میں،
کبھی مصلوب کی صورت،
کبھی منصور کی صورت۔

میرے یارو،
مجھے یاد رکھنا۔
میں تمہاری یاد کی ٹہنی کی سانسوں پر بسی خوشبو کی صورت تمہارا ہمسفر ہوں گا۔
میری نظریں،
جو اس ہوٹل کے شیشے پر جمی ہوں گی،
کبھی تم اس طرف آؤ تو یہ تمہارے ذہن کے گمنام گوشوں میں میری یادوں کے سارے زمزمے آباد کر دے گی۔

کبھی رات کے ممتا بھرے بازو تمہیں لوری سنا کر نیند کی آغوش بخشیں
اور سمندر سے ابھرتی تیز و میٹھی ہوائیں تمہیں پلکیں بچھانے پر مجبور کر دیں
تو میں ان جاگنے اور سونے کے لمحوں میں تمہیں آواز دوں گا۔

میرے یارو
مجھے یاد رکھنا۔
میں جو اس شہرِ وفا میں آ بسا اور اسے اپنی آخری منزل سمجھ بیٹھا
کہ جیسے میری جہدِ بقا کی آخری حد ہے۔
مگر کس کو دوامِ خضروی حاصل؟
میں ایک بار پھر اپنے جنوں کے امتحان خاطر نئی منزلوں

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

نئے راستوں پر چلنے کی تمنا میں
ہزاروں نقشِ پا اس سرزمین پر ثبت کر کے اب یہاں سے جا رہا ہوں۔

میں کہ جس کے لیے ہر راستہ اجنبیت کی ردا میں لپٹا ہوا تھا
تنہا اس نظر میں چل کے آیا تھا۔
مگر اے میرے رفیقو!
آج جب اس شہر سے جا رہا ہوں تو میرے دامن میں لاکھوں شفقتوں
الفتوں اور دعاؤں کے خزانے ہیں جو تم سب نے مجھے بخشے ہیں۔
یہی خزانے مجھے ایک بار پھر یہاں کھینچ لائیں گے
کہ ان شفقتوں کا قرض بھی مجھے چکانا ہے۔

خدا حافظ،
میرے پیارو...
میرے یارو...
خدا حافظ۔

آنے والی نسلوں کے لیے تحفہ

تم پوچھتے ہو، میں مر کیوں نہیں جاتا؟
تم میرے اس کرب کو کب سمجھ سکتے ہو
جو مرنے والوں کے ساتھ مجھے مرنے نہیں دیتا

کیا تم نے آج کے اخبار میں اُس بچے کی خبر پڑھی ہے
جس کے سر کو پتھروں سے کچل دیا گیا؟
یا اُس قیدی کی، جس نے حراست میں خودکشی کر لی؟
تم ایسی خبریں نہیں پڑھتے... میں جانتا ہوں

میں اُس بچے کے ساتھ تھا
جب اُس کا سر کچلا جا رہا تھا
(میری روح بھی ساتھ کچلی گئی تھی)

میں اُس قیدی کے ساتھ تھا
جس رات اُس نے خودکشی کی
اہلِ قفس اُس کے جسم پر نقش و نگار بناتے رہے
کہ وہ اُن کی مرضی کی بات کیوں نہیں کہتا
(وہ نقش و نگار میری روح پر بھی بنتے رہے)

اُس کی ہتھیلیاں بھاری پائیوں تلے لہولہان تھیں
جن پر سب بیٹھ گئے تھے
(سارا بوجھ میں نے اپنی روح پر سہارا لیا تھا)

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

اور جب ساری رات اُس کی زخمی پیٹھ پر دھمال پڑتا
(میری روح کی چیخیں اُس کی کراہوں میں شامل تھیں)

جب آخری زنجیر اُس کے سینے پر پڑی
اور اُسے لہو تھوکنے پر مجبور کر دیا
جب تک اُس کا دم ٹوٹ نہ گیا
اور شور نہ مچ گیا کہ "قیدی نے خودکشی کر لی"

میں مرنے والوں کے ساتھ تھا
میں نے اُس بچے سے، جس کا سر کچلا گیا
اور اُس قیدی سے، جس نے خودکشی کی
معاہدہ کر لیا

ہم نے چیزیں آپس میں بانٹ لیں :
انہوں نے موت چن لی
اور میں نے اُن کی موت کا کرب

وہ کرب
جو وہ اپنے چہروں پر آنے والی نسلوں کے لیے
چھوڑ گئے تھے

توکہتی تھی

جب جیون کے پالن سے تو ہار گئی تھی
جب سپنوں کی وادی بھی سنسان پڑی تھی
جب باہوں کی پیاس طلب کا ہار بنی تھی
جب ہونٹوں پہ چاہت بھی ویران کھڑی تھی
میں آیا تھا، ہاں میں آیا تھا
تو کہتی تھی
جب آنکھوں کے جھیل کنول گمنام پڑے تھے
محرومی کے گیت تیرے ساتھ کھڑے تھے
سارے خواب سہانے یکدم ٹوٹ گئے تھے
میں آیا تھا
تو کہتی تھی
جب اکلاپا ناگ تجھے پل پل ڈستا تھا
گھور اندھیرا تیرے چاروں اور کھڑا تھا
میں آیا تھا
تو کہتی تھی
جب میں آیا، سارے موسم بدل گئے
دُکھ کی شاخوں پہ خوشیوں کے پھول کھل گئے
محرومی کو مسکاں کی مہکار ملی
ہونٹوں کی چاہت کو خوشبو کی بہار ملی
جب میں آیا، جھیل کنول گمنام نہ رہے
سارے خواب سہانے اب بے نام نہ رہے

میں کہتا ہوں

ساری باتیں ایک فسوں تھا، ایک فسانہ
صادق لفظوں کے چہرے پر جھوٹ سجانا
جھیل کے ٹھہرے پانی پر تصویر بنانا

کتنا تھا بے ربط محبت کا افسانہ
ایک ویری نے تیرے مان کو توڑ دیا تھا
میں نے اپنی چاہت سے پھر جوڑ دیا تھا

لیکن وقت کے پہیے کو ہے کس نے روکا
تیری طلب تھی بادِ نسیم کا تازہ جھونکا

ہم تو سیدھے سادے لوگ تھے، کھا گئے دھوکہ
چھوڑو راہی، بھول چکو یہ باتیں ساری

بادِ صبا اور بادِ نسیم کی آہ زاری
اس کی ایک ضرورت تھی، بس وقت گزاری
ان باتوں میں آ کر تم نے بازی ہاری

شہر ملتان میں ایک سیاہ دن

شہر خاموش تھا
سالِ نو سرخ سورج کی کرنوں میں لپٹا ہوا
آنے والے جانگسل مرحلوں کی صداقت سے ناآشنا
ناتواں اور پُرہول قدموں سے آگے بڑھتا رہا

پیاسی دھرتی کے سینے سے زہراب لمحے ابھرنے لگے
سانس کی آنچ اندھے سوز کے بے انت لمحوں پر رواں
ان گنت لفظ کالی فضا میں لہو کے شراروں سے
تاریخ لکھنے کو آگے بڑھے

اس طرف عزم تھا، حوصلہ زندگی کی جلد کے لیے
خواہش بقا کی، خواہشوں کے جزیرے میں جلی لفظوں کا مفہوم تھا:
"شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑوں کی ہزار برس کی سانسوں پر بھاری رہی"

مقصدِ زندگی بیکراں
جس کی رگ رگ میں عزمِ جہد پھیلا ہوا تھا
ظلم آگے بڑھا، عزم پختہ ہوا

دیکھتے دیکھتے،
دہشتوں نے فضا کی آغوش کو جبر و قضا میں سمیٹ لیا،
وحشت و بربریت کے عفریت کو
روٹیوں کے طلب گار، بھوکے نہتے
(مگر عزم و ہمت کی روشن چٹانوں پر)
روشن کر گئے

جلتے آدمی کا پورٹریٹ

شہر سانپوں سے بھرا، ایک گھنیرا جنگل،
سانپ شہروں کے مقدر کے امین،
شاہراہوں، گلی کوچوں، بھرے بازاروں میں
کنڈلیاں مارے، پھیلائے ہوئے اپنے تھن،
ہر گزرے ہوئے حساس بدن پر
زہر آلود تشدد کے نشاں چھوڑتے ہیں

خوف کی لہر، آوارہ بلا کی صورت،
گھیر لیتی ہے سبھی زندہ مکانوں کے مکیں
وقت محبوس، فضا قہر، ہر ایک سو پہرے،
جسم معلوب سرِ راہ،
صدا گنگ، ستارے بے نور،
فکر بے سمت، سیہ رات، اندھیروں کے بھنور

آنکھ بینائی سے محروم، نظارے اندھے،
سانس رُکی ہوئی، ہر محوِ تماشا خاموش
آگ کا جسم، سرِ چوک، شہراں رقصاں
اک لمحہ، کہ قیامت کے بدن سے پھوٹا،
اک لمحہ، کہ ہوا ورطۂ حیرت،
جس میں ہر نفس ششدر و ویراں، حیراں

بند آنکھوں میں جلے آگ کے سمندر جیسے،
جاگتی آنکھ کسی خواب کا منظر دیکھے
گھور ویران اندھیروں میں چمکتے جگنو،
جشنِ آشفتہ سراں، رقصاں کناں

آگ کا جسم، در جھدِ بقا، موت کا رقص،
زہر آلود تشدد کی فنا، موت کا رقص،
سرسراتے ہوئے سانپوں کی قضا، موت کا رقص

24 اکتوبر 1978

تیرے شہر میں آج پھر اجنبی ہوں

تیرے شہر میں آج پھر اجنبی ہوں،
یہیں بُت بنا تھا،
یہیں بُت میں سانسوں کے موتی پروئے گئے تھے
یہیں گرم چھاتی کے نرم چشموں سے
بے جان مٹی کے پتلے کو خون اور حرارت ملی تھی

یہیں میرے بابا نے انگلی پکڑ کر
مجھے پاؤں چلنا سکھایا،
یہیں مکتبِ شہر کا راستہ میں نے دیکھا،
یہیں میں نے تجھ کو بھی دیکھا

جب تجھ کو دیکھا،
تو چاروں طرف سُرخ پھولوں کے موسم بھی دیکھے،
گلابوں کو کھلتے ہوئے، مسکراتے ہوئے میں نے دیکھا
یہیں خزاؤں کے معتوب موسم بھی دیکھے،
یہیں زمانہ ترے اور مرے راستے کی فصیلوں میں بدلا

ریل کی تیز سیٹی میں تیری صدا کی خوشبو
مری یاد کا، میرے ماضی کا حصہ بنی
میں بھی ماضی بنا،
میں اک اجنبی ہوں،
ترے شہر میں آج پھر اجنبی ہوں

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

آج پھر میں یہیں ہوں، اسی شہر میں ہوں،
مگر اب یہ میرا نہیں
مرے پاس سے میرا ماضی گزرتے ہوئے
میں نے کل شام دیکھا،
گلابوں کی خوشبو کو ویرانیاں ڈس چکی تھیں،
دھواں شہر کے حسن کو کھا چکا تھا

مرے پاس سے یوں گزرتے ہوئے اس نے دیکھا نہ تھا؟
اتنے سالوں کی دیوار کو پھاندنا اتنا آسان نہ تھا
کچھ بھی تھا
اجنبی کو ر آنکھوں کے سیلاب میں کوئی اپنا نہیں
کیوں کسی آشنا کی طلب ہو،
کہ سب آشنا ناآشنا کی بھیڑ میں کھو چکے ہیں

میں اک اجنبی ہوں،
ترے شہر میں آج بھی اجنبی ہوں

غزل

اسے دل سے بھلانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے،
مجھے پھر لوٹ آنے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

میں اپنا آپ کھو بیٹھا ہوں اُس کو ڈھونڈنے میں،
پتہ اپنا لگانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

ابھی یادوں کے کھنڈر چشمِ حیراں میں سجے ہیں،
نئی دنیا بسانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

نئی آبادیاں بس جائیں گی اُجڑی زمیں پر،
پرانے شہر ڈھانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

غبارِ آرزو باقی ہے اُجڑی ساعتوں کا،
نئے منظر سجانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

زمانہ درمیاں ہے، میں ادھر ہوں، تُو اُدھر ہے،
نئے رستے بنانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

اگر ممکن ہو سب کچھ بھول جا، مجھ کو چھوڑو،
مجھے رسمیں نبھانے میں ابھی کچھ دن لگیں گے

غزل

وفا گریز بھی رہنا، جفا سے ڈرنا بھی،
عجیب طرفه تماشا ہے پیار کرنا بھی

کہیں تو جا کے رکے اب یه کاروانِ طلب،
کبھی تو آئے ہمیں اپنے دل سے لڑنا بھی

کبھی سمجھ نه سکے اپنے دل کی مجبوری،
وه بھولنا بھی اسے، ٹوٹنا بکھرنا بھی

غزل

زمانے آرزو کے، ہست کی خواہش نبھانے کے،
ہوئے سب خواب، دیکھے خواب جو اچھے زمانے کے

تمہیں چاہا، تو اپنے ہست کو بھی نیستی جانا،
تمہیں پایا، تو دیکھے چار سُو موسم گنوانے کے

وہی ویرانیاں، نالہ گری اور ہجر کے موسم،
وہی چہرے بتوں کے، بت گروں کے، بت سجانے کے

شکستہ آرزو، شامِ شفق آمیز دل گیری،
ہزیمت، معمل آگے بڑھی ہے آزمانے کے

غزل

میں روز روز نئے احتساب سے گزروں،
میرے خدایا، کتنے عذاب سے گزروں

جو خوش رہوں تو زمانہ فساد بن جائے،
جو آنسوؤں سے لڑوں، اک عتاب سے گزروں

میں کس لیے ترے سارے جہاں کا دُکھ دیکھوں،
میں کس لیے ترے روزِ حساب سے گزروں

جو چپ رہوں تو زمانہ دہائی دینے لگے،
زباں کھلے تو نئے سراب سے گزروں

یہ خار خار زمیں اور خار خار فلک،
اے ذوالجلال، کبھی تو گلاب سے گزروں

مقامِ صدق و وفا پر نثار کیا کرتے،
جو تم سے پیار نہ کرتے، تو اور کیا کرتے

غزل

آئینہ دل کے سمندر میں دہائی دے گا،
میں نہ ہوں گا تو میرا عکس دکھائی دے گا

تو صدا دے، تو میں پاتال سے بھی لوٹ آؤں گا،
گیت سوئی ہوئی لہروں میں سنائی دے گا

کس کے ہاتھوں میں ہے اب عزمِ وفا کا پرچم،
کون سوکھے ہوئے لمحوں میں دہائی دے گا

صہیب کی پہلی سالگرہ پر

بات چلی تھی نرگس سے، ہو گئی رنگا رنگ،
شانی، نیناں، مشی، مبی میرے سارے رنگ

آج کی شام صہیب کو لکھوں پیار جل ترنگ،
آؤ مل کر اس کا پہلا سال کریں خوش رنگ

سب مل کر کریں دعائیں عمر درازی کی،
اس کے جیون کو ملے رب کی کرم نوازی کی

یہ دعا ہے میری

یہ دعا ہے مری
ہر نیا سال تیرے لیے عندلیبِ خرد کے شگوفوں سے مہکتا رہے،
اور تیرے پیار و جذبوں کے مسمار گھر پھر سے تعمیر ہوں

یہ دعا ہے مری کہ
مبارک کے اس طشتِ مہتاب میں،
خواہشوں اور امنگوں کے جزدان میں،
زندگی خواب بنتی رہے ہر روشنی کے لیے،
آشتی کے لیے، آگہی کے لیے

پھول کھلنے کے ان موسموں کے لیے
جن کی آغوش میں چہچہاتی چکوروں کی مدھر صدائیں
منور کریں آرزو کی سنہری ساعتوں کو

ترے سینۂ عشق پر رنگوں کے انبار کھلنے لگیں
پھول بن کے ترے بام و در کو سجاتے رہیں
ہم تیرے پیار کے گیت گاتے رہیں

یہ دعا ہے مری
ہر نیا سال تیرے لیے عندلیبِ خرد کے شگوفوں سے مہکتا رہے

غزل

امیرِ شہر، غریباں پہ نالشیں کیسی
جو چھوڑنا ہے تو ہم پر نوازشیں کیسی

صدائیں دیتی ہیں طوفان، چپ کے ساحل سے
یہ تیرگیِ مسلسل میں بارشیں کیسی

ہجومِ شہر فراواں سہی، مگر یارو
لکھی ہیں چہروں پہ ان کی یہ سازشیں کیسی

ہر ایک آنکھ میں نفرت برنگِ تیرہ شبی
لبوں پہ تند ہنسی کی نمایشیں کیسی

جیون

کچھ جھوٹ ملا کر بات کرو
کچھ سچ بھی کہو پر جھوٹ کے ساتھ
کیوں اپنا جیون کھوتے ہو؟

بہتر ہے کہ اب تم اپنے لیے
کوئی اور کنارا ڈھونڈ سکو

ہم جیون کو اندھیار چکے
ہم پیار کی بازی ہار چکے
بہتر ہے کہ تم بھی ہوش کرو

جب کشتی ڈوبنے والی ہو
کوئی اور سہارا ڈھونڈ سکو
کیوں اپنا جیون کھوتے ہو؟

آئینہ دل کے سمندر میں دہائی دے گا
میں نہ ہوں گا تو میرا عکس دکھائی دے گا

غزل

جلی شاخوں پہ برگ و بُور کی امید کیا رکھنا
سفر میں نخلِ سایہ دار کی امید کیا رکھنا

شگفتہ زندگی کی خواہشیں دم توڑتی جائیں
اندھیروں میں سحر آثار کی امید کیا رکھنا

کڑکتی دھوپ میں چیلوں کے سائے چار سُو ناچیں
زمینِ سوختہ پر خار کی امید کیا رکھنا

بصارت کھو گئی ہے کور آنکھوں کے سمندر میں
یہاں پر دیدۂ بیدار کی امید کیا رکھنا

بصیرت چُپ کے پاتالوں میں اتری، پھر نہیں لوٹی
درِ زندہ کسی ایثار کی امید کیا رکھنا

میں کیوں تختی کو آویزاں کروں گھر کے کواڑوں پر
گئے موسم کی صورت یار کی امید کیا رکھنا

غزل

میں اپنی پہچان کھو چکا ہوں
سوچ کے بادبان کھو چکا ہوں

زندگی بے سمت ہو گئی ہے
منزل کا نشان کھو چکا ہوں

جہد کے شہر سے نکل کر
حرمتِ داستان کھو چکا ہوں

لہو کی رفتار سست ہو گئی ہے
سانس کی آن کھو چکا ہوں

اعجازِ راہی، کسے کسے یاد کروں
میں تو اک جہان کھو چکا ہوں

میں نے اب اخبار کو پڑھنا چھوڑ دیا
یعنی جھوٹ سے باتیں کرنا چھوڑ دیا

غزل

کب تک یہ شام، شامِ عزادار دیکھنا
کب تک لکھا ہے صبح کو نادار دیکھنا

دشتِ طلب میں ایک ہی منظر ہے دور تک
راتوں کو خواب، خواب میں آزار دیکھنا

پھر شہرِ آرزو میں اُڑا طائرِ قفس
پھر باز کم نگینہ کو شرر بار دیکھنا

گرنے کو ہے یہ جسم کی دیوار، دھیان کر
دل بچ رہا تو سایۂ دلدار دیکھنا

آؤ نبھائیں جہدِ مسلسل کی آرزو
پھر شہر، گاؤں، کوچہ و بازار دیکھنا

ہمیں برباد کرنے کا اُسے یارا نہیں تھا
وگرنہ اپنے فن میں اتنا بے چارہ نہیں تھا

غزل

تلخ سوچوں پہ سلگنا طاری
زندگی ایک ایک لمحہ بھاری

جس نے بھی وحشتوں کے پل توڑے
اس پہ الزام لگا غداری

اپنے اسلاف کی توصیف نہ سن
ساری باتیں ہیں فقط اخباری

تجھ کو جینا ہے تو زنجیریں توڑ
ورنہ ہے عمر تری غم خواری

لمحہ لمحہ ہے وحشتوں سے بھرا
شہر ہے مبتلائے بے زاری

غزل

تپتی زمین پہ پاؤں نہ دھر، اب بھی لوٹ جا
کیوں ہو رہا ہے خاک بہ سر، اب بھی لوٹ جا

اب کھلے ہوئے ہیں صداقت کے راستے
ہو نہ جائیں وقت کے دربند، اب بھی لوٹ جا

آنکھوں کے بادبان سے ویرانیاں بھی دیکھ
کس درجہ لٹ چکا ہے یہ گھر، اب بھی لوٹ جا

راہی، ابھی تو شام کی سرخی بجھی نہیں
ضد نہ کر، لَیت و لعل نہ کر، اب بھی لوٹ جا

نوشتۂ دیوار پڑھ بھی لے
دار و رسن کی بات نہ کر، اب بھی لوٹ جا

شبنم رات کے پچھلے پہر جدائی میں جب رو دیتی ہے
پھولوں کے رخسار پہ رقصاں گرد کے بادل دھو دیتی ہے

غزل

اُسے عہدِ محبت بھی نبھانا چاہیئے تھا
مگر اُس کو تو جانے کا بہانا چاہیئے تھا

ہمیں بھی تہمتِ شوریدہ سری راس نہیں
وصالِ آرزو کو نارسائی کا فسانہ چاہیئے تھا

ملیں تو یہ زمین و آسمان خوش رنگ خوشبو
مگر تنہائی میں مژگانِ ہستی کو ٹھکانا چاہیئے تھا

اس دھرتی پر کب راہی جی خوابوں کوتعبیر ملی ہے
یوں بھی اکثر جاگتے منظر خام ادھورے رہ جاتے ہیں

غزل

میں آئینہ ہوں جسے دیکھنے سے ڈرتا ہے
وہ شہر یار مری سوچنے سے ڈرتا ہے

میں اپنی سوچ کے گرداب سے نکل نہ سکا
دلِ شکستہ مری ہارنے سے ڈرتا ہے

میں وسوسوں کی سیہ دلدلوں میں رہتا ہوں
مجیب وقت ابھی آئینے سے ڈرتا ہے

سرِ صبح ابھی شہرِ آرزو نہ بسا
کہ آفتاب ابھی ڈوبنے سے ڈرتا ہے

غزل

تُو جو گیا تو لذتِ شام و سحر گئی
تجھ بن حیات بے سرو سامان گزر گئی

میں بھی حصارِ ذات کے گرداب میں رہا
گردش کا اک جہان تھا، تُو بھی جدھر گئی

صدیوں سے میرے سامنے منظر ہے ایک سا
اُجڑی زمیں، بوڑھا فلک سرد کر گئی

میں بھی ہوں کچھ اداس، پریشاں آج کل
کچھ شہر بھی خموش ملا جب نظر گئی

قطعہ

بس کہ اب وقت کی رفتار کو تھم جانے دے
بس کہ اب شامِ غریباں کو سحر پانے دے

بس کہ اب صبرِ ایوبی کو تڑخنے سے بچا
بس مرے حوصلے ویران نہ کر جانے دے

غزل

ہمیں بھی سرِّ محبت کا رازداں کر دے
رموزِ عشق میں اسرارِ خود نہاں کر دے

کبھی تو کھول دے نامنکشف حقیقت کو
کبھی تو سامنے آ، خود کو بھی عیاں کر دے

خمیدہ ڈولتے عقدے کبھی تو حل کر دے
کھنڈر پذیر سوالوں کو جاوداں کر دے

کچھ اس طرح سے زمانوں میں روشنی پھیلے
نظامِ عدل زمیں پر بھی آساں کر دے

دل کی تختی پہ لکھے سب نام ادھورے رہ جائیں گے
تھک کر بیٹھ گئے تو سارے کام ادھورے رہ جائیں گے

غزل

تُو جو گیا تو لذتِ شام و سحر گئی
تجھ بن حیات بے سروساماں گزر گئی

میں بھی حصارِ ذات کے گرداب میں رہا
گردش کا اک جہان تھا، تُو بھی جدھر گئی

صدیوں سے مرے سامنے منظر ہے ایک سا
اُجڑی زمیں، بوڑھا فلک سرد کر گئی

میں بھی ہوں کچھ اداس، پریشاں آج کل
کچھ شہر بھی خموش ملا جب نظر گئی

آئے ہو، کچھ دیر رُک نہیں سکتے؟
میں انتظار میں برسوں سے راہگزار میں ہوں

19اپریل کا ایک دن

تمہیں خبر ہے؟
حصارِ ہستی میں جانے کتنے منظر

تمہاری آمد کے منتظر تھے
سماعتوں کی عدالتوں میں نہ جانے کتنے لطیف نغمے
تمہاری آواز پانے کو مضطرب تھے

تمہیں خبر ہے؟
بیاضِ ماضی عذاب بن کر متاعِ ہستی پہ
طعنہ زن ہے

گلاب سوچوں میں زرد یادوں کی تلخ کونپل
ابھر رہی ہے

تمہیں خبر ہے
تمہاری بیگانگی کا مکروہ چہرہ

گمان کی ٹہنی پہ اک پرندہ
اداس منقار، پر کے نیچے چھپا ہوا ہے

حرف تمنا

عجب شہرِ ملامت ہے
جہاں حرفِ صداقت
چار سُو مجہول آوازوں کے جنگل میں
ہراساں ہے

سبھی چہروں پہ عمروں کی مسافت
داد کے سیسے میں ڈھلتی ہے

ہزاروں خواہشیں
صدموں کے ویرانوں میں پلتی ہیں

کھلی آنکھوں میں
سپنے دیکھتے عمریں گزرتی ہیں

کوئی بھی چارہ گر دل میں
سکون کے بیج بونے کو نہیں آتا

عجب شہرِ ملامت ہے

شہر خموشاں

پھر دل کے بند کواڑوں پر
کیوں دستک آج سنائی دے؟

کیوں شہرِ خموشاں میں اجڑی
یادوں کو آج رہائی دے؟

میں تیری یاد کا سرمایہ
سب وقت کے ہاتھوں ہار چکا
میں اپنی زندہ سانسوں میں
اگلا پازہر اتار چکا

میں اتنی دور چلا آیا
سب راہیں، رستے ڈوب گئے
آفاق پہ ہنستے چہروں کے
آباد جزیرے ڈوب گئے

اب کون دلِ آشفتہ کو
امید کی روشن راتیں دے؟

اس دل کی باتیں جھوٹ میاں
سب روشن راتیں جھوٹ میاں
کب شہر میں پانی برسا ہے؟
امڈی برساتیں جھوٹ میاں

مقتل کے اندھے دوراہے پر

صبح کی روشنی اب تلک خواب ہے
خواب ظلمت فشاں
رات کے تلخ سائے ہر اک نفس پر
بخت ظلمت فشاں

یہ اک تنازعِ تضادات
زنجیرِ محکومیت، بربریت و مجس
تشدد کی بیساکھیاں
جبر کی جادوگری
نرم جسموں پہ زخموں کی کاریگری

ہاتھ کٹنے پہ حاصل
گدائی کا فن
کارِ وحشت گراں
مقصدِ مکنتِ دو جہاں
اور بس، اور بس

ان کے ماتھے پہ لکھی ہوئی بھوک کا نسخۂ کیمیا
مان لو جو کہیں
ہاں کہو جو کہیں

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

سوچ لو، ذہن کو
فکرِ احرار کو نذرِ اخبث کرو
یا جسارت کرو

رسمِ کمبودیا بے بسی کی نیابت نہیں
اشتقاقِ تجسس کی بنیاد میں
خونِ تازہ بھرو

مسلکِ جانگسلِ اختراق، تشدد کا ٹکوا بنے
خواب سے روشنی کی نمو
تب نئے دور کا آشیانہ بنے

رسم وفا جانتا ہوں

مجھ کو الزام نہ دے، رسمِ وفا جانتا ہوں
ہاں ترے نام پہ جو زخم ملتے ہیں مجھ کو
اپنی وارفتہ مزاجی کا صلہ جانتا ہوں

میں نہیں چاہتا کوئی سایہ
ترے مہکے ہوئے گلشن کی سزا بن جائے

وہ ستارا جو مری رات میں تابندہ ہے
کسی زہریلے مقدر کی ردا بن جائے

میں تو فنکار ہوں اور میرا تشخص تو ہے
ایک اک سانس میں رقصاں ہیں تیرے روپ و سروپ

عظمتِ مادرِ گیتی ہے مری روح کا جوت
میرا فن، میری نگارش کی بقا
میرا احساس، میرے فکر کی بنیاد مرتب تجھ سے

میرے اسلاف کی تاریخ ہے تجھ سے روشن
میرے بچوں کا مہکتا ہوا خوش رنگ چمن

تجھ کو اے شعرِ خدا، بعدِ خدا جانتا ہوں
مجھ کو الزام نہ دے، رسمِ وفا جانتا ہوں

ظلم کا سلسلہ

لمحوں کے آشوب میں
موت کے روپ میں رقص کے احکام صادر ہوئے

دیکھتے دیکھتے
پھر خدا، کائنات، آسمان و زمیں
سرخ معصوم خوں میں نہانے لگے

ساری بستی لہو کے سمندر میں لرزاں
اجڑتے ہوئے گھر قیامت کا منظر
تڑپتے ہوئے جسم ماہی کی صورت
عذابِ مسلسل کی دہلیز پر موت کے گیت گاتے

ازل کے سفر پر رواں
وحشی قدموں کی گمنام سی چاپ
وقت کی ڈائنیں جبر کی تال پر رقص کرتی رہیں

جسم سانسوں کی حدت سے
محرومیوں کی صدائیں پروتے رہے
سرسراتی ہوا زندگی کا پتہ پوچھتی
ساری بستی کے دیوار و در سے الجھتی رہی
ظلم جاری رہا رقص جاری رہا

میں جو صدیوں سے اندھے سفر پر رواں
سوچتا ہوں کہ کیوں ہر نیا دور محنت کشوں کے لیے
اک نئی کربلا؟
کیوں شکاگو سے ملتان کے شہر تک
ظلم کا ایک ہی سلسلہ؟
اے خدا اے خدا

پرندے

پرندے!
جب پرِ پرواز پا کر
فضا میں اڑانیں لگاتا ہے
ہوا کے دوش پر تیرے یہ نغمے
تجھے عطا کرتے ہیں سربلندی
وہ بلندی، جو تیری کاوش کا حاصل ہے

سن اے معصوم اور نازک پرندے
غلامی جب تیرے قدموں میں ہوگی
تو پھر تاریکیوں کے آسیب جھانکیں گے
تیرے رستے کو روکیں گے
مگر تو بے خطر، بے خوف
بس عزمِ بلندی رکھ

یہ نہ سوچ کہ کوئی گھات لگا کر
اک چھرے سے تیری زندگی تاریک کر دے گا
تیری سانسوں کے دھاگے توڑ دے گا

یا پھر کوئی بدوضع صیاد و ساحر
کسی پنجرے میں تجھے قید کر کے
تیری اونچی اڑانیں چھین لے گا
جہاں محرومیاں تجھ کو ڈرائیں گی
تو سوچے گا
کاش میں اس پرواز کے چکر میں نہ پڑتا

تو تب ہمنشینوں میں
مجرم اور بزدل کے عذابوں سے بھرے
طعنوں سے گزرے گا

مرحلہ تجریدِ جنوں

میں شجاعت ہوں، میں جراءت ہوں
میں ہوں عظمت کا نشاں
میں دلیروں کا جہاں
میری رگ رگ میں نہاں روشنیاں

میں ہوں آزاد، ہے آزاد میرا پاک وطن
ایک اک سانس میں رقصاں ہیں تیرے روپ و سروپ
عظمتِ مادرِ گیتی ہے مری روح کی جوت

میرا فن، میری نگارش کی بقا
تیرے احساس، میرے فکر کی بنیاد مرتب اس سے

میرے اسلاف کی تاریخ ہے اس سے روشن
میرے بچوں کا مہکتا ہوا خوش رنگ چمن
میں ہوں آزاد، ہے آزاد میرا پاک وطن

یک بیک جیسے فضا رنگ بدل کے آئی
میرے ہنستے ہوئے بستے ہوئے ایوانوں پر
خونی و سفاک لٹیروں کی نظر آن پڑی

ہوس و حرص کے مارے ہوئے بنئے اٹھے
میرے پاک وطن کی جانب
اپنے منحوس قدم لے کے بڑھے

ظلم جب بڑھنے لگا
اور اندھیرے پھیلے
پاک دھرتی کے محافظ جاگے،
میری دنیا کے جیالے جاگے

گیت

میرے دیس کی گلیاں، میرا روپ نکھار
اس کے برج و منارے، میرے دل کا ہار

میری سوچ کی ہر ڈالی پہ لکھا ہے اس کا نام
میری رگ رگ میں روشن ہیں اس کے دن اور شام

افضل اس کی مٹی، افضل اس کا پیار
میرے دیس کی گلیاں، میرا روپ نکھار

سوہنی، سسی، بانو، ہیر سیال
پنوں، مرزا، ماہیّا، رانجھا اور مہینوال

سارے عشق نہیں تیرے، تیرا حسن خمار
میرے دیس کی گلیاں، میرا روپ نکھار

داتا، بری، مہر، بہاء، غلام فرید
باہو، شمس، بھٹائی، غازی اور مرید

سارے رنگ سجیلے، ہار و سنگھار
میرے دیس کی گلیاں، میرا روپ نکھار

میرے سارے شعر، فسانے، گیت و خیال
تیری خاک سے روشن میرا فن، میرا جمال

تیرے گیت میں لکھوں، میں تیرا فنکار
میرے دیس کی گلیاں، میرا روپ نکھار

یادوں کی ڈائری سے ایک ورق

ابھی شاخوں پہ برگ و بور لگنے بھی نہ پائے
ابھی تو دشتِ امکاں خواہش سے ابھرا تھا

ابھی ویرانۂ دل میں قیس لمحوں کی آہٹ
اک حبابِ آرزو میں تھی
کسی آتے ہوئے موسم کی ہریالی
یقین کے مرحلوں میں پابجولاں تھی

ابھی تنہائیوں کی دھول
پاؤں سے لپٹ کر ورطۂ حیرت میں غلطاں تھی

بس اک لمحہ تھا، جس میں
جاگتی آنکھوں نے خواہش کے جزیرے طے کیے تھے

ادھر میں تھا، ادھر
کچے گھڑے پر زندگی حیران و ششدر تھی

بس اک لمحہ تھا
مژگانِ فلک پر ایک ساعت کے لیے ٹھہرا
پھر اس کے بعد
ویراں، بانجھ منظر چار سُو پھیل گیا

مرحوم بھائی کے لیے ایک نوحه

اگر میں جانتا، تم سے میں اتنا پیار کرتا ہوں
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں تمہارا نام لکھا ہے

میں اپنی چاہت کی سب لکیریں مٹا دیتا
میں اتنا پیار کیوں کرتا؟

اگر میں جانتا، آدھی صدی کی یه رفاقت
راستے میں ٹوٹ جائے گی
بالآخر تم میرے بابا کی صورت
مجھ کو تنہا چھوڑ جاؤ گے
تو میں تمہارا ساتھ کیوں دیتا؟

اگر میں جانتا، تم بھی میری آنکھوں میں ٹھہرا ایک قطره ہو
میں آنکھیں بند کر لیتا
تمہارے عکس کے سارے دریچے بند کر لیتا

میں اس قطرے کو بہنے سے پہلے ہی
شکسته دل کے ویراں آستانوں میں سجا لیتا

مگر میں جانتا کب تھا؟
میں تم سے پوچھتا ہوں، جب خزاں کے موسموں میں
زرد پتوں کی صدائیں بین کریں گی

میرے جسم و جاں میں گزریں گی

انہیں اب کون روکے گا؟
میں تم سے پوچھتا ہوں، کارزارِ زندگی کی کربلا میں

میں اکیلا کیا کروں گا؟
کون روکے گا فلک کی تلخ کامی کو؟
محبت ہو تو شعلوں کی لپک سے ڈر نہیں لگتا
مگر تم جانتے کب تھے
تمہیں جانے کی جلدی تھی

پیارے بیٹے شکیل کے لیے

تو زیست کے شاہکار کا آئینہ جمال ہے
تو حسنِ بے کراں ہے، فقید المثال ہے
تجھ پر اترتے رہیں ہمیشہ بہار کے موسم
تو خوابِ گل کی خوشبو، دل کا خیال ہے

اعجاز راہی نیویارک
14 اگست2002

روح تے جسم دی دوری

میں مہینوال نہ رانجھا مرزا، نہ مجنوں نہ ماہیا
توں سوہنی نہ ہیر نہ سسی نہ لیلی نہ میرا

نہ میں سونئے ڈنگر چارے نہ پھریانمیں تھلاں
نہ توں کچے گھڑے تے ٹھلی نہ صحباں جیاں گلاں

نہ کھیڑے میری راہواں ڈگیاں نہ پایاں میں نہراں
نہ توں گھر دیاں کندھا بھنیاننہ تکیاں توں لہراں

نہ میں تخت ہزارہ ڈٹھا، نہ پنوں دیاں گلیاں
نہ توں جھنگ سیال دی الہڑ نہ بھبھور دی پھلیاں

نہ تے میں نوں وٹے مارے تیرے شہر وسیکاں
نہ تو ڈولی چرھدیاں ماریاں ہیر دی مافق چیکاں

جد تونمیں عشق لڑی دے موتی، کی مجبوری
آفیر مل مکائیں بلیے روح تے جسم دی دوری

یہ رات بہت ہی ظالم ہے

یہ رات بہت ہی سفاک ہے
ہم کب تک خوف میں لرزتے رہیں گے؟
یہ دہشت رگوں میں زہر سا اُترتی ہے
کل کا سورج سب کے لیے ندامت کا پیام لائے گا

پھر کیوں نہ ہم اک شور کریں؟
ہم جاگ رہے ہیں، لیکن اب
آرام سے سونے والوں کو
اس شور سے یوں بیدار کریں
کہ جاگ پڑیں یا مر جائیں
یا ہم اس سے کنارہ کر جائیں

صدیوں کی گھڑیاں ڈھلنے لگیں
دن رات کے آنگن جلنے لگے
یہ شور مچاتی آوازیں
احساس میں بجتی ہیں لیکن
اب کان ترستے ہیں ان کو

صبح کی روشنی اب تلک خواب ہے

صبح کی روشنی اب تک خواب ہے، خوابِ ظلمت فشاں
رات کے تلخ سائے ہر نفس پر، بختِ ظلمت فشاں

عجب آرزو کا سفر ہے، مگر یہ سفر بے بسی کا ہے
جہاں سے چلے تھے، ابھی تک وہیں کھڑے ہیں ہم
سانس لینا دشوار، جینے کی خواہش رگ و پے میں لرزاں

مگر کھوکھلے قہقہوں کے عقب میں تناؤ، تضادات
زنجیرِ محکومیت، بربریت و وحشت
تشدد کی بیساکھیاں، جبر کی جادوگری

کراں تا کراں سنسناتی ہوئی جبرِ امروز کی کربلا
افق تا افق زرد چہروں کا سیل رواں
اجڑے کھیتوں میں بکھری عصمتوں کی کہانیاں
خون میں ڈوبتی میری شام و سحر

اب تک آنکھ کی پتلیاں کل کے بہتے خون میں تر
خشک آنکھوں کے ویران ساحل پر تپتی ہوئی ریت
پابجولاں مری خواہشوں کا نگر
فقط بے ثمر آرزو کا شجر

چار سو زرد رو، تیغ بردوش زہری ہوا
سانس کی نالیاں زخم آلود
فکر کے راستے سارے مسدود ہیں

جانگسل چاہتوں کی سرحد سے پرے

جانگسل چاہتوں کی سرحد سے پرے
رفت و نابود زمانوں سے پرے
دل کے برباد مکانوں سے پرے
شہرِ یاراں کے نشانوں سے پرے

آنکھ کی پتلیوں پہ رقص کناں
عکسِ نادید کی لہروں میں نہاں
وہ کہ امیدِ صبحِ تابندہ
اب کہ آزردہ فسانۂ شب

ستم آشفتگی، سربمہر امید
وقتِ پیہم سہیم، خوابِ سحر
اشکِ نادید کی لہروں میں گھیری
تیری یادوں کے شانوں سے پرے

آرزو اک سرابِ چشمِ یقین
شامِ تنہا، ملول، قعرِ حزیں

جدائی کی گھڑی ویران سی تھی
فلک پر ایک تارا نہیں تھا

میں قیدی ہوں

میں قیدی ہوں، تیرے دستِ طلب کا
اپنی خواہش کی فصلوں کا
تیرے شاداب خوابوں کے سرابوں کا
تمہاری یاد کی پرچھائیوں کا
اور ان گزرے ہوئے لمحوں کی خوابیدہ فضاؤں کا
جنہیں ہم نے زمانے سے چرا کر
اپنے دامن میں بھر لیا تھا

وہ حسن بے پناہ تھا مثالی جمال تھا
وہ یوسفِ ثانی تھا، فقید المثال تھا

OH! MY OLD P. NUMBER

OH! MY OLD P. NUMBER

My old Number
A sweet recognition, fulfillment of the self,
A ceaseless quest, accomplishment of the self,
A hope unrealized, a culture unreachable yet sublime,
A stream of continuity, with timber's gentle chime.

Oh, my Old P. Number,
I have sought you through the years,
Against the hurricane of Time,
The nakedness of fears,
The thunder of hostile clime
You remain a dream, a cherished avenue of lime.

The times were wicked, nights without light,
Days stripped of sunshine, happiness torn in plight.
History oppressed, its pages soiled,
Aspirations withered, souls recoiled.
Tyranny ruled, serpents kissed, evil danced.

Then
Life unfolded, new shoots came,

And put the shameless to utter shame.
Rivers of tears birthed newness,
Choked woods breathed into freshness,
Mourning vales transformed to calmness.

Yet the dream remains incomplete,
Remorse with nostalgia replete.
The remembrance of the past,
The fullness of a dream that haunts
Oh! my Old P. Number.

I Miss You, My Son

I miss you, my son
I miss you too much.

When I was young,
My mother's love held me close.
When I wept for a doll,
She embraced me and whispered:
"Don't weep, my son, don't weep.
One day the moon will visit your corridor,
In full bloom and fragrance,
And you will play with it
Do not weep for a doll."

I dreamed of that day,
But it never came.
On a sorrowed morning,
I awoke with a cry
And saw the saw of Time
Cut not only the chain of her breath,
But also the thread of my dreams.
I was alone,
Like a frightened antelope,
Walking the long, sorrowed path of life.

Then, once again, I felt secure
When your shoulder rose to meet mine.
The moon returned to my corridor,
With bloom and fragrance.
But it was not for long.

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

Now
I am again afraid, insecure.
You left me alone,
And journeyed across seven seas,
To rejoice in your own life.
My tears fall for my moon,
But no one sees them.
I hide them beneath the curtain of my eyes.
Who will cry for my tears?
Who will embrace me in that hour?
No one no one.

You are far from my eyes, my son,
But never far from my heart.
I love you, my son.
I love you too much.

Dear Adeel

On a clear day, August 16, 2001,
I remember
The day of August 16, 1997,
When you stood at the threshold of a new life.
I remember
Every face blossomed with the lightning of joy,
Every lip moved with sweet wishes,
Every heart prayed for your illustrious journey,
Your radiant future.

Today, the same day returns,
But three years have passed,
Bearing two blossoms of fruition:
Misaal   the candle of life,
Sohaib   the treasury of learning and excellence.

On this day, August 16, 2001,
My lips move once again in prayer,
To bless you with a better life,
Sound health, prosperity,
An illustrious future filled with happiness
For you, for your children,
For your family,
Your mother, your sister, your brother,
And their children.

With love,

Yours, Father

ڈاکٹر طفیل عباس

ڈاکٹر اعجاز راہی کی زندگی مزدور تحریک کے نشیب و فراز کی آئینہ دار ہے وہ پی آئی اے کے باوقار افسر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی فکری وابستگی اور اصولی موقف کے باعث مزدور طبقے کے دلوں میں جگہ بنا گئے مارشل لا کے دور میں جب یونینز پر پابندیاں لگیں اور حقِ آواز دبایا گیا، تو انہوں نے اپنی ذات پر ہونے والے جبر کو ذاتی نقصان نہیں بلکہ اجتماعی جدوجہد کا حصہ سمجھا ملازمت سے جبراً محرومی کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ نئے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا اور ثابت کیا کہ ایک سچا رہنما حالات کے طوفان میں بھی اپنی شناخت اور وقار قائم رکھتا ہے ان کی جدوجہد ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اصول اور وقار وقتی مشکلات سے کہیں زیادہ دیرپا ہوتے ہیں

پریشان خٹک

اعجاز راہی نے افسانے کو موضوعات، تکنیک اور فن کے اعتبار سے جدت بخشی انہوں نے زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو نئے زاویوں سے دیکھا اور انہیں ایسے اسلوب میں پیش کیا جو روایت سے مختلف اور تازگی سے بھرپور تھا ان کے افسانوں میں نہ صرف عصری مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے بلکہ انسانی جذبات، سماجی تضادات اور مزدور طبقے کی جدوجہد بھی ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے انہوں نے علامت اور حقیقت کو اس طرح ہم آہنگ کیا کہ افسانہ محض کہانی نہیں رہا بلکہ ایک فکری احتجاج اور تخلیقی تجربہ بن گیا یہی جدت انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے اور اردو افسانے کے ارتقائی سفر میں ایک نمایاں سنگِ میل ثابت ہوتی ہے

الطاف پرواز

اعجاز راہی ایک سچا انسان ہے اس کی تمام تحریریں ناموسِ صداقت کی حفاظت کے لیے وجود میں آئیں وہ اپنے ہم عصر اہلِ قلم میں ممتاز اور صاحبِ کردار ہنرکار ہے یقیناً ابھی اسے اور بلندیوں کی منزلیں طے کرنی ہیں

سرشار صدیقی

جب زندگی کے سب در بند ہوں تو صرف مستقبل پر بھرپور یقین ہی موت کے حصار میں شگاف ڈال سکتا ہے یہی یقین اعجاز راہی کا سرمایہ ہے یہ سرمایہ اسے کسی دستِ غیب سے نہیں ملا بلکہ طویل اور مسلسل جدوجہد کے لمحہ لمحہ تجربے سے حاصل ہوا ہے زندگی کے دکھ سکھ بیان کرنے کے لیے زندگی کو دیکھنا ضروری ہے، لیکن بیان میں سچائی اور خلوص اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب زندگی کو عملی طور پر جینے کا سلیقہ بھی نصیب ہو اعجاز راہی نے زندگی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر تخلیق کا سفر طے کیا ہے

منصور قیصر

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ 'سیلف میڈ' کا اردو ترجمہ کیا ہے تو میں کہوں گا:
اعجاز راہی اس شخص میں بے پناہ صلاحیتیں اور پہاڑ جیسے عزائم ہیں انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کے دو ستونوں کو استوار کیا بلکہ خود کو بھی تراشا شاید انہیں معلوم نہ تھا کہ مسلسل محنت انہیں اعلیٰ تعلیم دلائے گی، 'تیسری ہجرت' جیسا کلاسک لکھوائے گی اور ایسی نظمیں تخلیق کروائے گی جو تخلیقی سفر کا سنگِ میل بن جائیں گی

محمود شام

اعجاز راہی سرابوں اور خوابوں میں حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے میری اس سے ملاقات مختلف چوراہوں پر ہوئی، ہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں مگر باقاعدہ ملاقات کی نوبت آج تک نہیں آئی وہ اندرونی دھیر وں میں اپنی راہ بناتا رہتا ہے، کبھی وقت کی عدالت میں اپنے انسانوں سے گوائی لیتا ہے، کبھی 'تیسری ہجرت' کی رد ادبیات کرتا ہے اور کبھی دعاؤں کے نوحے سناتا ہے اس کے ہاں منظرنامہ علامتوں سے تشکیل پاتا ہے، لیکن یہ علامتیں اجنبی نہیں بلکہ بھرپور معنویت رکھتی ہیں اس کا اظہار اتنا سادہ ہے کہ علامتیں خود بولنے لگتی ہیں

رؤف شیخ

افراطِ فکری، خود غرضی، ذات پرستی اور بے حسی کے اس دور میں اعجاز راہی کا 'انحطاطِ رائے' ایک مجسم احتجاج ہے یہ احتجاج محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ ایک فکری اور تخلیقی رویہ ہے جو معاشرتی زوال کے خلاف بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے ان کا انداز منفرد ہے، تجربہ انوکھا، لہجہ نیا اور اسلوب پختہ، جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے اعجاز راہی نے افسانے اور شاعری کو محض ادبی اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے سماجی شعور اور انسانی وقار کی بازیافت کا وسیلہ بنایا ان کے ہاں علامتیں اجنبی نہیں بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کی آئینہ دار ہیں، اور یہی ان کی تحریروں کو ایک گہری معنویت عطا کرتی ہیں وہ روایت کے جامد سانچوں کو توڑ کر ایک نئے تخلیقی جہان کی بنیاد رکھتے ہیں، جہاں فنکار کا قلم احتجاج بھی ہے، امید بھی اور جدوجہد کا استعارہ بھی یہی انفرادیت انہیں اردو ادب کے منظرنامے پر ایک روشن اور مستقل حوالہ بنا دیتی ہے

علی حیدر ملک

اعجاز راہی کا تعلق ترقی پسند ادبی حلقے سے ہے وہ افسانہ نگار بھی ہے اور شاعر بھی، اور ساتھ ہی ٹریڈ یونین سیاست کا ایک پرجوش کارکن بھی فنکار اعجاز راہی کے باطن سے ایک سوال ابھرا تھا :

کس کے ہاتھوں میں ہے اب عزم و وفا کا پرچم
کون سوکھے ہوئے لہجوں سے رہائی دے گا

یہ جرات، یہ خلوص اور یہ محبت اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، جس کے سہارے وہ ہر فن کی دنیا میں کامیاب ہوگا

سعید وارثی

اعجاز راہی ادب میں منافقت کے قائل نہیں اور نہ ہی مصلحت کے وہ جو سوچتے ہیں کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں ان کا تخلیقی عمل ایک شفاف آئینے کی مانند ہے جس پر حال کی گرد نہیں جمی ہوتی افسانہ ان کے ادب کی بنیاد ہے اور وہ اس میدان میں کامیاب ہیں ان کے کردار اضطراب میں تخلیق نہیں ہوتے بلکہ علامتوں کے ذریعے بڑے حقائق کی منظرکشی کرتے ہیں ان کا خاصہ انسانیت کے دھوکے کو پہچاننا ہے
معاصرین کے تاثرات کے ساتھ یہ باب اختتام پذیر ہوتا ہے بے شک اعجاز راہی نے آسمانِ ادب پر جلوہ گر ہو کر اپنے لیے وہ مقام بنایا جو سالہا سال کی ریاضت اور جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے وہ نئے آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے

میرے بعد (ڈاکٹر اعجاز راہی)

مجتبیٰ اختر

ڈاکٹر اعجاز راہی 5 اپریل 1942 کو پشاور میں پیدا ہوئے اور 1963 میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن، کراچی سے قانون، اور سندھ یونیورسٹی جامشورو سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس وقت وہ پی آئی اے میں افسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں ان کا عملی کیریئر مختلف شعبوں میں پھیلا ہوا ہے، جن میں یونیورسٹی پروفیسر، تحقیقی اسکالر، رسالے کے مدیر شامل ہیں انہوں نے ملک گیر ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی نظریاتی جدوجہد کے باعث مشکلات کا سامنا کیا

ڈاکٹر راہی ادب کے میدان میں ہمہ جہت شخصیت ہیں خوش اسلوب شاعر، دلکش افسانہ نگار، جری نقاد، معروف محقق، محترم ماہرِ تعلیم، نڈر کالم نگار اور قابلِ قدر مترجم وہ تمام شعبوں میں یکساں شہرت رکھتے ہیں، مگر اپنی افسانہ نگاری پر سب سے زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں بلاشبہ وہ پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں، جن کی تکنیک منفرد ہے اور جن کا موضوع عام انسان کی زندگی ہے میں ان کی اس صلاحیت سے متاثر ہوں کہ وہ اپنے معاشرے کی عصری نبض کو محسوس کرتے ہیں اور انسانی جذبات و ذہنی کیفیتوں کو نہایت خوبی سے پیش کرتے ہیں

کوائف نامہ

نام :اعجاز حسین
ادبی شناخت :ڈاکٹر اعجاز راہی
والد کا نام :غلام صمدانی
پیدائش :پشاور، 5 اپریل 1942

تعلیم

ابتدائی تا میٹرک: سی بی ٹیکنیکل ہائی اسکول، لال کرتی، راولپنڈی(1949–1959)
انٹرمیڈیٹ: سرگودھا بورڈ(1969)
گریجویشن: پشاور یونیورسٹی، پشاور(1975)
ایم اے اردو: پشاور یونیورسٹی، پشاور(1977)
ایل ایل بی: اردو لا کالج، کراچی یونیورسٹی(1977)
عربی زبان: انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد(1986)
سیکریٹریٹ ٹریننگ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد - کورسز برائے "فائنینشل کنٹرول اینڈ بجٹنگ(1984) "
پی ایچ ڈی: جامعہ سندھ، جامشورو(1986)
موضوعِ تحقیق: اردو افسانے میں علامت نگاری
نگرانِ تحقیق: ڈاکٹر نجم الاسلام
ممتحن: ڈاکٹر غلام مصطفی خان، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

پیشہ ورانہ خدمات

کارگو سیلز مینیجر، پی آئی اے (کراچی، پشاور، اسلام آباد، تاشقند)
ایڈیٹر، اسلام آباد ورلڈ اسلامک ٹائم
ایڈیٹر، ہفت روزہ سفیر، پشاور
اسسٹنٹ ڈائریکٹر، نیشنل بک کونسل (ریسرچ و ایڈمن)

معاونِ علمی، مقتدرہ قومی زبان (ریسرچ اسکالر، دارالترجمہ)
اسسٹنٹ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (شعبہ اردو)
ایڈوکیٹ، سول کورٹ راولپنڈی (مختصر عرصہ)
انچارج، روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن (پبلک ریلیشننگ سیکشن)

اعزازات و ایوارڈز

ایم آر کیانی ایوارڈ، صوبہ سرحد (1994) - کتاب سات نوبل انعام یافتہ ادیب
گولڈ میڈل، اباسین آرٹ کونسل، صوبہ سرحد (2005) - کتاب اردو افسانے میں علامت نگاری
ادبی ایوارڈ، صوبہ سرحد(1992)
قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں مقالہ پیش کرنے کا اعزاز(1990)
پشاور یونیورسٹی اعزاز(1998)

تصانیف

افسانے :تیسری ہجرت (1974)، گواہی (1978)
ناول :معتوب (1989)، شام ڈھلے (2003)
شاعری : بے برکت دعائیں (1979)، میرے بعد (2008)
تحقیق و تنقید :اردو افسانے میں علامت نگاری، اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ، اظہار، پسِ اظہار، سات نوبل انعام یافتہ ادیب، تاریخِ خطاطی، جمیل ملک: فن اور شخصیت، ادراکِ ماورائے حسیات
تراجم :افریقہ اور ایشیا کے بہترین افسانے، یورپ اور امریکہ کے بہترین افسانے، جبرانیات، لوریکس
تالیفات :اصولِ تحقیق، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، ویو پوائنٹ، ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو، بہترین نئی کہانیاں

ٹی وی و ریڈیو ڈرامے

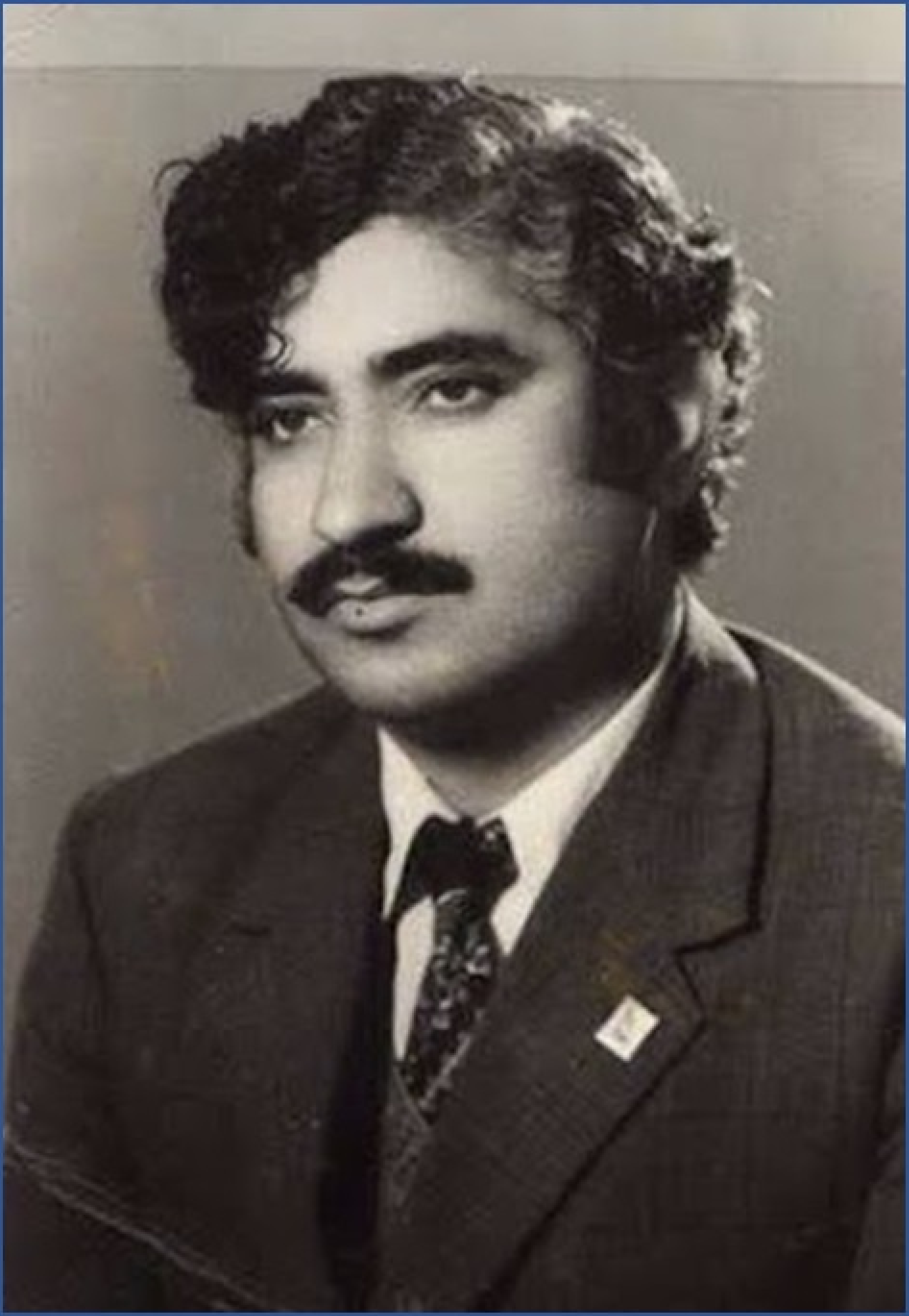
ٹی وی :کرچیاں (1991)، خواہشوں کے جزیرے (1995)، نہیں تعبیر کوئی (1996)، ویزہ (1997)، تیسرا سنگ میل (1998)، حجابِ آرزو (1999)، جرم و سزا (2006)
ریڈیو :متعدد ڈرامے راولپنڈی، اسلام آباد، پشاور اور کراچی ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوئے، جن میں نہیں تعبیر کوئی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے

ادبی وابستگیاں

حلقہ اربابِ ذوق، راولپنڈی - دو مرتبہ سیکرٹری
حلقہ اربابِ ذوق، پشاور - تین مرتبہ سیکرٹری
لکھنے والوں کی انجمن، راولپنڈی - بانی سیکرٹری
رکن، پاکستان رائٹرز گلڈ

مزدور و سماجی خدمات

آل پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن - رکن
آل پاکستان ٹریڈ یونین کونسل - ٹریڈ یونین ازم سیکرٹری
قومی مزدور محاذ، صوبہ سرحد - صدر
کسان مزدور پارٹی، صوبہ سرحد - صدر
روڈ ٹرانسپورٹ ایمپلائز فیڈریشن - چیئرمین
شاہ ذلمو جرگہ - چیئرمین



ڈاکٹر اعجاز راہی